© rasailojaraid.com

اجتماعیاتی مسلک

سب جانتے ہیں کہ حضرت علامہ خالص علمی و تحقیقاتی کاموں کے لیے جوانی ہی سے خود کو وقف فرما چکے تھے، ان کی اسی فنا ئیت علمی کا ثمرہ ہے کہ ان کی حیات ہی میں دار المصنفین کا شہرہ چار وانگ عالم میں پھیل چکا تھا۔ اس کے باوجود ذرا دیکھیے والا یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے اولین اجلاس میں بمبئی میں اور پھر اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی میں شریک ہیں، ۱۹۱۷ء میں مجلس علمائے بنگالہ منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرما رہے ہیں، ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت میں علمائے ہند کی تنہا نمائندگی یورپ میں فرما رہے ہیں، ۱۹۲۳ء میں صوبۂ بہار کی خلافت کانفرنس کے اجلاس میں کرسئ صدارت کو زینت بخشے ہوئے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں حجاز اور مصر پہنچکر ابن سعود اور شریف حسین میں کامیاب مصالحت کرا رہے ہیں، ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلمائے ہند کے تاریخی سالانہ اجلاس، منعقدہ کلکتہ کی زمام صدارت ہاتھ میں لیے علماء کرام کو سمت عمل کی صحیح نشان دہی فرما رہے ہیں۔ ادھر الہلال کی ضیا پاشیوں میں نور کی کتنی تابناکیاں ہیں جو اسی آفتابِ علم کی رہینِ منت ہیں۔ پھر تحریکِ پاکستان کے بھونچالی دور میں وہی صاحب نظر ہے جو بظاہر الگ تھلگ مگر خاموشی سے "اسلام کا سیاسی نظام" اپنی نگرانی میں مرتب کروا کے لیگیوں کے حوالے کر رہا ہے۔ پھر جب پاکستان بن چکا تو اس کی دعوت پر ۱۹۵۰ء میں یہاں آکر علامہ ہی کی فعالیت ہے جو مراحلِ دستور سازی اور تشکیل قانون اسلامی میں کارفرما نظر آتی ہے۔ دوسری سمت دیکھیے تو وہی بالواسطہ دیکھیے جماعتِ اسلامی کی ہائی کمان کو جادۂ حق پر لانے کی حکیمانہ کوشش فرما رہے ہیں، کبھی دیکھیے تو وہی ہیں جو شانِ فقر لیے تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں نم دیدہ دست بہ دعا دکھائی دے رہے ہیں اور زعمائے تبلیغ و سعتِ فکر و عمل کی وصیت کر رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں ـــــ غرض خلوت پسندی اور اجتماعی جدوجہد میں عجیب دلکش و دلفریب ربط پیدا کئے ہوئے ہیں ۔ یہی حضرت علامہ کے اجتماعی مسلک کا امتیاز ہے جو در اصل قرآن پاک کی دو آیات پر اپنی اساس قائم کئے ہوئے تھا، ایک تو

(۱) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (یعنی ہر تقویٰ اور نیکی کے معاملہ سے تعاون)

اور دوسرے

(۲) لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا (یعنی اپنی خدمات میں مخلوق کی طرف سے جزا یا قدر دانی کے صلہ سے بے نیازی)

اسی لیے حضرت علامہ کے مسلکِ اجتماعی میں بڑی ہمہ گیری تھی، ان کا اجتماعیاتی مسلک آویزش و محاذ آرائی کی تلخیوں سے پاک، منصب و جاہ کی حرص اور نمود و شہرت کی نفسانی خواہشات سے منزہ تھا۔ یہاں کسی خاص جماعت میں نہ انضمام تھا نہ کسی سے انقطاع بلکہ انضمام و انقطاع کے درمیان "بے غرض تعاون" تھا جو صرف امتِ محمدیہ سے محبت اور اس کی دل سوزی کے محرکات اور صرف رضائے الٰہی کی طلب کے اضطراب قلبی کا نتیجہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی ہزار رحمتیں اور پیہم نوازشیں ہوں ایسے پاکیزہ مسلک سید الملت والدین حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (قدس سرہٗ) کی روح پر فتوح پر۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لغات کی تحقیق

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

راقم الحروف نے ایک کتاب بنام "اردو مصدر نامہ" چند سال قبل تالیف کی تھی۔ اس کے بعد دوسری کتاب بنام "ادبی بھول بھلیاں" شائع ہوئی۔ یہ دوسری کتاب رشید حسن خاں کی تالیفات "اردو املا" اور "زبان و قواعد" پر تنقید تھی۔ میں حیران و متعجب تھا کہ اردو زبان اور رسم الخط پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور کوئی مدافعت نہیں کرتا اور میں نے مدافعت کی نیت سے جو کاوش کی ہے اس کی کوئی تائید نہیں کرتا۔ کیا واقعی اب اس زبان میں اور اس کے رسم الخط میں ایکدم عیب ہی عیب پیدا ہو گئے۔ اپنے بیگانے سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ کوئی بناؤ سنگار کے بہانے اس کے ناک کان کترتا ہے۔ کوئی اس کے خم دار ناخن اور ٹیڑھی چونچ دیکھ کر ترس کھاتا ہے اور نوکیں کاٹتا ہے۔ کوئی نظر بد سے بچانے کے لیے اس کے اوپر کالک چڑھا دیتا ہے۔ کوئی چھڑی سے اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ غرضکہ اردو کے لیے یہ بڑا آزمائش دور ہے۔

اس زبان میں لغات کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود نئے نئے الفاظ اور مکروہ تراکیب ایجاد کی جا رہی ہیں۔ فصاحت تو ایک بے معنی لفظ ہو کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہ گیا ہے۔ ڈیزائنر اس کے رسم الخط پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ قدیم املا میں بھی عیوب ہی عیوب تھے اس کی بھی اصلاح کی جارہی ہے۔ وہ حروف جو اردو املا کا جزو لاینفک تھے ان کے بارے میں بڑی جرأت سے کہا جارہا ہے کہ مردہ لاشیں ہیں جو اردو رسم الخط محض اس لیے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے کہ عربی سے اس کا لسانی رشتہ قائم رہے۔ ٹھیک ہے آپ لسانی رشتہ قائم نہ رکھیے۔ مگر کوئی نہ کوئی رشتہ تو رہے گا۔ اب عرب ممالک سے جو نیا رشتہ قائم ہوا ہے اس سے کیونکر انکار کیا جائے گا اور اس نئے رشتے کے لیے لسانی رشتہ کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت پڑ رہی ہے۔

ابھی فروری ۱۹۸۴ء میں مجھے دو کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک "زبان ولغت" دوسری "اردو املا اور اس کی اصلاح" یہ دونوں کتابیں ڈاکٹر ابو محمد سحر پروفیسر وصدر شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی تصانیف ہیں۔ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ایک فقیرِ بے نوا کا کوئی ہمنوا تو ظاہر ہوا۔ انتہائے اشتیاق میں سرسری طور پر ایک ہی نشست میں سب دیکھ ڈالیں۔ خوشی ہوئی کہ بڑی حد تک انھوں نے وہی کہا ہے جو میں چاہتا تھا۔

بے شک ایک مستند لغت کی ضرورت ہے۔ ابھی تو پاڑ بندھ رہی ہے۔ یہ پاڑ کب بندھ چکے گی اور کب لغت نویسی کا کام شروع ہوگا؟ اور کیا ہم جیسے مشتاق عمر رسیدہ طلبہ کو اپنی زندگی میں اس سے استفادہ کا موقعہ مل جائے گا؟ کیا ان تجاویز کا حشر سیاسی تجاویز جیسا تو نہیں ہوگا؟ کیا یہ کھلونا دے کر بہلانے کی بات تو نہیں ہے؟ اس قسم کے متعدد سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جواب تو وقت ہی دے گا۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ حکومت اردو کے لیے کتنا روپیہ خرچ کر رہی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس کے نتیجے میں صالح ادب سطح پر ابھر رہا ہے یا فاسد؟ ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

بہرحال سحر صاحب کی دونوں کتابوں کی تالیف میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ قابل تحسین ہے۔ میری ناچیز تالیف کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے نگاہِ جوہرشناس سے دیکھا ہے اور عزت افزائی کی ہے وہ بھی موجب ممنونیت ہے۔

ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے تمام مندرجات سے بالاستیعاب مجھے اتفاق نہ ہو لیکن مجموعی طور پر ان کی سعی مشکور ہے۔ کتابوں کے سرسری مطالعہ کے بعد خود بھی کچھ لکھنے کو جی چاہا۔ جو کچھ قلم برداشتہ ضبط تحریر میں آیا وہ درج ذیل ہے:

پروفیسر صاحب نے اُن اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے جو آثر لکھنوی نے "سرمایۂ زبان اردو" اور "نور اللغات" کے بعض مندرجات پر وارد کیے ہیں۔ اور اعتراض اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہیں لیکن بعض مقامات پر راقم الحروف کو ان کی رائے کے ماننے میں تامل ہے۔

(۱)

نور اللغات میں ایک محاورہ لکھا ہے۔ زار و نزار رونا۔ معنی لکھے ہیں زار زار رونا، زار و قطار رونا، بہت رونا، سند میں جان صاحب کا شعر لکھا ہے:

اور لیکر چلے وہاں سے کہار
روتی جاتی تھی میں تو زار و نزار

آثر لکھنوی کہتے ہیں کہ زار و نزار رونا محاورہ نہیں ہے۔ عورتیں زار زار رونے کو زاروں زار رونا کہتی ہیں۔ حضرت مؤلف اسی کو زار و نزار پڑھ گئے۔ سانح اس پر سحر صاحب اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ آثر کی اس صراحت کی روشنی میں کہ عورتیں زاروں زار کہتی ہیں ممکن ہے جان صاحب کے شعر میں زاروں نا ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسے زار و نزار لکھ دیا گیا ہو لیکن زار و نزار رونا عام طور پہ مستعمل ہے۔ بظاہر یہ زاروں زار نہیں ہے۔ زار اور نزار دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اگر زار نزار رونا صحیح ہے تو زار و نزار رونا کی صحت میں بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ (زبان و لغت)

آصف عرض کرتا ہے کہ محاورہ زاروں زار رونا ثبوت طلب ہے اور زار و نزار رونا اس سے بھی زیادہ ثبوت طلب ہے۔ اگر ان دونوں محاروں کا صحیح ہونا ثابت نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے؟ ایک کوشش اگر شعر کی بندش کو سمجھنے کی بھی کر لی جائے تو شاید مشکل آسان ہو جائے۔

زار و نزار حال واقع ہوا ہے ضمیر متکلم (میں) کا، نہ کہ رونے کا۔ یعنی میں روتی ہوئی جاتی تھی اس حال میں کہ زار و نزار بھی۔ زار و نزار تھی۔ زار و نزار کے معنی عاجز درماندہ و مجبور۔ اس سے رونے کی کیفیت کا ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔ مصرع کی عبارت یوں مرتب کی جائے تو مفہوم واضح تر ہو جائے گا کہ "میں تو روتی ہوئی زار و نزار جا رہی تھی۔ یعنی جانے پر مجبور تھی اور اپنی بیچارگی پر رو رہی تھی۔" واضح ہو کہ "روتی" اسم حالیہ "روتی ہوئی" کا مخفف ہے۔ ترکیب نحوی یوں ہوگی کہ جاتی تھی فعل، میں ضمیر متکلم ذوالحال روتی ہوئی اور زار و نزار، تینوں حال۔ ذوالحال اور حال مل کر فاعل بنا۔ فعل اپنے فاعل سے مل کر فاعل بنا۔ فعل اپنے فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔

(۲)

سحر صاحب لکھتے ہیں۔ آب بمعنی چمک دمک مؤنث ہے۔ لیکن آتش نے ایک شعر مذکر نظم کیا ہے:

نشہ ہی میں یا الٰہی میکشوں کو موت دے
کیا گہر کی قدر جب آب گہر جاتا رہا

جلال نے مفید الشعراء میں اس شعر کو مذکر کی سند میں پیش کیا ہے۔ جس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقلید میں چند دوسرے لغت نگاروں نے بھی اسے مختلف فیہ قرار دیا ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کو آتش کا تسامح قرار دیا ہے۔ سحر صاحب کی رائے ہے کہ نہ مختلف فیہ ہے نہ تسامح ہے بلکہ قصداً ضرورت شعری کی وجہ سے مذکر باندھا ہے کیونکہ ردیف "جاتا رہا" تھی۔ (زبان ولغت ص۵۶)

وآصف عرض کرتا ہے۔ اردو کا محاورہ ہے "آب جاتی رہی" کہنا چاہیے تھا "موتی کی آب جاتی رہی" فارسی میں آب رفتن محاورہ نہیں ہے اور آب گوہر، آب مروارید، آب لولو، موتیا بند کو کہتے ہیں (بہار عجم) آب گوہر ترکیب پاکر اردو محاورہ کا جزو نہیں بنا۔ خواجہ آتش تردد میں پڑ گئے کہ اس صورت میں آب گوہر کو مونث قرار دیں یا مذکر۔ فارسی ترکیب میں آکر اس کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہوگئی۔ فارسی میں تذکیر و تانیث نہیں ہے پس انھوں نے قیاس سے کام لے کر اسے مذکر قرار دے دیا۔ یہ خطائے اجتہادی ہے۔

ضرورت شعری کی وجہ سے زبان ولغت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ لفظ ازروئے قواعد غلط یا فصاحت سے گرا ہوا نہ ہو اور محاورہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔

(۳)

آگے سحر صاحب لکھتے ہیں: آب بمعنی چمک دمک کو آتش نے مذکر باندھا اس طرح کی اور مثالیں بھی اساتذہ کے کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً مینہ عام طور پر مذکر ہے لیکن داغ نے مونث کہا ہے:

مینہ برستی ہے دکن میں یہ مثل ہے مشہور
تو نے برسائے گہر فیض سے معدن معدن

الخ۔ (زبان ولغت ص۵۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واصف عرض پرداز ہے: تھن کو مذکر داغ نے باندھا ہے؟ یا وہ خود مؤنث بندھ گیا؟ تحقیق طلب ہے۔ ممکن ہے کاتب کی کرامت سے جنس بدل گئی ہو۔ اور کاتب تو اس سے بھی زیادہ عظیم و عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ تذکیرو تانیث کے فرق سے وزن شعر میں فرق نہیں آیا۔ اگر یہ تاویل نامقبول ہو تو دوسری تاویل یہ ہے کہ حضرت داغ کی تربیت قلعۂ معلیٰ میں ہوئی ہے۔ قلعۂ معلیٰ کی اور شہر کی زبان میں فرق تھا۔ ممکن ہے کہ قلعہ میں تھن کو مونث بولتے ہوں جیسے ظفر نے گھڑیاں کو مؤنث باندھا ہے (اردو مصدر نامہ ص۲۱۶) اسی طرح لفظ چھان بین اور چھان بنان کے متعلق ایک واقعہ تذکرۂ سائل ص۱ پر درج کیا گیا ہے۔ قلم (آلۂ کتابت) کو داغ اور دیگر شعراء نے مذکر باندھا ہے (فرہنگ آصفیہ) پودوں کی قلم لگانا یا شورہ نمک نمک مصری وغیرہ کی قلم مؤنث ہے۔ اسی سے دھوکا کھا کر بعض ناواقف لوگ آلۂ کتابت کو مؤنث سمجھ لیتے ہیں۔ مذکورہ مثالوں سے چمک دمک یا بجھاؤ کے معنی میں آب کی تذکیر کا جواز نہیں نکلتا۔

(۴)

آگے سحر صاحب لکھتے ہیں: یہ تو ایسے الفاظ کا معاملہ تھا جن میں اختلاف رائے ہے۔ اساتذہ کے کلام میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو بالکل غلط ہیں اور جن کا چلن بھی نہیں ہے۔ کسی ایک استاد نے اپنے کسی ایک شعر میں نظم کر دیا ہے۔ آتش کے ایک شعر میں نزاع کے معنی میں نزع کا استعمال اسی قبیل کا ہے:

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع سے
دل میں غبار کا فرو دیندار لے چلے

حالانکہ پہلے مصرع میں کتابت کی غلطی کا احتمال ہے۔ ممکن ہے "ان کی نزاع" ہو لیکن اس طرح کے مقامات کی قیاسی تصحیح سے احتراز لازم ہے۔ ہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی مستند ماخذ میں اُن کی نزاع" ملے تو اس کو درست کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ صورت میں نزع یا نزاع دونوں الفاظ یا صرف نزع کے تحت یہ صراحت کر دی جائے گی کہ آتش نے بمعنی نزاع استعمال کیا ہے۔ الخ (زبان ولغت ص۶۰)

داصف عرض کرتا ہے کہ نزع اور نزاع دونوں لفظ اردو میں اپنے متعین اور واضح معنی کے ساتھ اس قدر عام اور غیر مشکوک ہیں کہ کسی تسامح یا تصرف کا امکان نہیں۔ آتش کے بارے میں یہ خیال کہ انھوں نے نزع کو بمعنی نزاع باندھا ہے محض بد گمانی ہے۔ یہ یقیناً نقل درنقل کی غلطی ہے۔ "باہم نزاع" یا اور کچھ ہوگا۔ کاتب نے سبقت قلم یا اپنے اجتہاد سے باہم کا ترجمہ لکھ دیا ہوگا۔ لغت کو ایسی تردد پیدا کرنے والی سندوں سے پاک رکھنا چاہیئے۔

(۵)

سحر صاحب لکھتے ہیں: اساتذہ کے کلام میں ایسے تلفظ بھی ملتے ہیں جو نہ اصل کے مطابق درست ہیں نہ مروجہ تلفظ کے اعتبار سے۔ ایک لفظ ہے مبرہن۔ سودا نے ایک جگہ اسے صحیح استعمال کیا ہے:

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مداحی کا
ذات پر جس کی مبرہن کنہ عز و جل

لیکن ایک دوسرے قصیدہ میں مبرہن بسکون دوم وفتح سوم نظم کیا ہے۔

سجدہ کریں ہیں مہر وسہ در پہ انھوں کے روز و شب
مبرہن اس سے یوں ہوا داغی ہیں یہ غلام دو

لغت میں ضمناً یہ لکھ دیا جائے گا کہ سودا نے اس طرح بھی کہا ہے۔
(زبان ولغت ص۶۳)

© rasailojaraid.com